سخنان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظام نَو کے تقاضے

’’وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے زاویۂ فکر اور اخلاقی اقدار میں تبدیلی ایک لازمی امر اور مسلمہ حقیقت ہے۔ جرمنی کا مفکر ہیگل اس اصول کی تشریح اپنے فلسفۂ مثبت اور منفی سے کرے گا۔ مارکس اس کی وجہ پیدائش کے ماحول میں تبدیلی بتائے گا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوگا کہ دورِ روحانیت ختم ہو چکا۔ اب مادیت کا دورہ ہے اور اسی ماحول میں فلسفۂ منفی و مثبت (Logical Positinism) کے علاوہ کسی اور فلسفہ کی گنجائش ممکن نہیں۔ نیز یہ کہ حقیقت کی کسوٹی صرف انسان کے حواسِ خمسہ ہی ہیں۔ ان کے علاوہ تمام چیزیں بیکار، فرسودہ اور بے ہودہ (Nonsensical) ہیں۔ اصولِ اخلاق، اظہارِ جذبات کے علاوہ کچھ بھی نہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ خدا ہے نہ روح، نہ آخرت ہے نہ جزا و سزا یہ ہے وہ نظریہ جس کا پرچار کئی مفکرین مثلاً کارنپ (Cornop) اور ایر (Ayer) وغیرہ نے خوب کیا۔

آج جب کہ تہذیبِ مغرب ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے فلسفۂ روحانیت کو یکسر ختم کیا جا چکا ہے موجودہ زمانے کا ترقی یافتہ انسان ایک دوراہے پر کھڑا ہے وہ ذہنی کشمکش، احساسِ گناہ اور اخلاقیات کے سلسلہ میں عدم تحفظ کا شکار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ ایسے ترقی یافتہ ملک میں نوّے فیصدی اشخاص مختلف قسم کے ذہنی امراض میں مبتلا ہو چکے ہیں ان کی زندگیاں ماہرانِ نفسیات کی مرہونِ منت ہیں لیکن مغرب کا ترقی یافتہ انسان بھول چکا ہے کہ جسم اور دماغ ایک ایسے رشتے میں منسلک ہیں جس کو توڑ کر انھیں علٰیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے ڈاکٹر سلاٹر (Dr. Slaughter) اپنی کتاب (Mdencine of movenes) میں لکھتا ہے کہ ذہنی کوفت السر اور کینسر ایسے مہلک امراض کا پیش خیمہ ہے ہمارے ملک میں بھی دماغی مریضوں کی کمی نہیں، عدم تحفظ کا اندازہ بیمہ کمپنیوں کی دن دونی رات چوگنی ترقی سے لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن آخر اس عدم تحفظ کا تدارک کیا ہے اور اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟

یہ ہے وہ سوال جو موجودہ دور کے فلسفیوں اور ماہران نفسیات کے ذہنوں کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ وجودیت (Existentalism) کے علمبردار کہتے ہیں کہ اس کا حل ہمارے اپنے رویہ (Attitude) میں تبدیلی ہے۔ ہم بحیثیت انسان ہر شئے سے افضل ہیں اس مدرسۂ فکر کا ایک عظیم فرانسیسی فلسفی سارتر اپنی مشہور کتاب (Being and Nothingness) میں اس طرح

رقم طراز ہے(''جس مدرسۂ فکر میں ہم زندگی گزار رہے ہیں ہم خود اس کے ذمہ دار ہیں۔'')

"We are responsible for all the Ideas we live in"

لیکن یہ صرف دل کا بہلاوا ہے۔ اس سے ہمارے پیچیدہ دماغی، سماجی اور معاشی مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح فرائڈ کی تحلیل نفسی بھی ایک کامیاب طریقۂ صحت نہیں کیونکہ وقتی طور پر تو لوگ اس ذہنی کشمکش سے صحت یاب ہوجاتے ہیں مگر مرض پھر عود کر آتا ہے۔

ان گوناگوں پریشانیوں کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے مادہ کی روح پر ترجیح کا تخیّل۔ یونان کا مایۂ ناز مفکر افلاطون اپنی کتاب Symposium میں لکھتا ہے کہ اگر ہم پُرمسرت زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہمیں مادی حدود کو توڑ کر روحانی سرحدوں میں داخل ہونا ہوگا یہی فلسفۂ مذہب ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر مذہب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جہاں انسان روحانی پیشواؤں کی اقتداء پر مجبور ہوجائے جیسا کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ　　سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف

پس نہایت وثوق ویقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دورِ حاضر کے پریشان حال انسان کو دماغی سکون اور اطمینانِ قلب سوائے دامنِ مذہب کے اور کہیں نصیب نہیں ہوسکتا۔ لیکن وہ مذہب ایسا ہونا چاہئے جس میں آفاقی ہمہ گیری ہو، جس کے اصول سادہ اور فطری ہوں، جس میں اتنی جاذبیت اور حسن ہو کہ اس کی صداقت کے پرچار کی خاطر سقراط ایسا عظیم مفکر اور عیسیٰؑ ایسا پیغمبر اولوالعزم موت کو لبیک کہنے سے دریغ نہ کرے، لیکن اس کے لئے انسان کو یقین محکم کی دقیق منزل تک پہنچنا ہوگا جس کے راستے دشوار اور پرخطر ہیں۔ لیکن وہ منزل ہے جہاں پہنچنے کے بعد یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ پہنچنے والا کہہ اُٹھتا ہے ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ علی اس خدا کی پرستش کرتا ہے جسے اس نے دیکھا نہیں؟ خدا کی قسم اگر حجاب ہائے حائلہ میری نظروں کے سامنے سے ہٹا دیئے جائیں تو خداوندتعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے متعلق میرے ایمان واعتقاد میں نہ کوئی زیادتی ہوگی نہ کمی۔'' کیا وجودیت کے علمبردار فلسفی اس سے بہتر Authentic Faith یعنی یقین محکم کی کوئی مثال پیش کرسکتے ہیں؛ ہرگز نہیں۔

لیکن یہ منزل کب حاصل ہوتی ہے؟ جب معیارِ کامیابی روحانی ترقی کو قرار دیا جائے۔ اس تاریک کھنکھناتی ہوئی مٹی کو جس سے جسم انسان کی تخلیق ہوتی ہے اور جو مادی ترقی کی طرف نوعِ انسانی کو کھینچ رہی ہے ایک ثانوی اہمیت دے دی جائے۔ یہاں اقبال جیسا مفکر یہ کہنے پر مجبور ہے ؎

خاک تاریکی کہ نامِ او تن است　　عقل از بیدادِ او در شیون است
فکر گردوں رس زمین پیما ازو　　چشم کور و گوش ناشنوا ازو
از ہوس تیغِ دو رو دارد بدست　　رہرواں رادل برین رہزن شکست
شیر حق ایں خاک را تسخیر کرد　　ایں گلِ تاریک را اکسیر کرد
مرتضیٰؑ کز تیغ او حق روشن است　　بوتراب از فتح اقلیم تن است

ہر کہ در آفاق گردد بو تراب　　باز گرداند ز مغرب آفتاب
ہر کہ زین بر مرکبِ تن تنگ بست　　چوں نگین بر خاتم دولت نشست
زیر پاش اینجا شکوہِ خیبر است　　دست او آنجا قسیم کوثر است
از خود آگاہی ید اللّٰہی کند　　از ید اللّٰہی شہنشاہی کند

یہی وہ لوگ ہیں جو موت ایسی بھیانک چیز کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے ہیں۔ حق کی پیروی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے کہ موت ان پر آن پڑے یا وہ موت پر جا پڑیں۔ یہی ہیں صحیح مصداق ''فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ'' کے۔ وہ موت سے اتنے مانوس ہوتے ہیں جتنا کہ بچہ پستانِ مادر سے۔ یہ یقین محکم اور ترقی روحانی ان میں وہ خود اعتمادی پیدا کرتی ہے جس کے ہوتے ہوئے گوناگوں پریشانیوں اور مصائب میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ ''مجھے موت کی پرواہ نہیں، آئے اور طاقت آزما کر دیکھ لے۔ میرا نام عباسؑ ہے، دریا چھین لوں گا اور ضرور چھین لوں گا۔'' ان کے قول اور عمل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کے ظاہر و باطن یکساں ہوتے ہیں۔ یہ دنیا میں بھی حُر ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ ان کی زندگیاں سادہ، پاکیزہ اور عالمانہ ہوتی ہیں۔ اتنے راسخ الاعتقاد کہ وقت آن پڑے تو اصول کی خاطر کربلا ایسے خونیں معرکہ کو جنم دے دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو وقت کی پیروی نہیں کرتے بلکہ وقت ان کے نقوشِ پا کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ لوگ فرائڈ کی اصطلاح میں ایسے مافی الضمیر (Unconscious) سے خائف نہیں ہوتے ان کے Ego کا رشتہ Superego اور بیرونی دنیا سے صحت مند ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت اس قدر بلند، ان کی روحانیت اس قدر رفیع ہوتی ہے کہ کربلا کا میدان ہو یا کوفہ کا بازار، ابن زیاد کا محل ہو یا یزید کا دربار۔ ان کے دماغی سکون کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ طاغوتی طاقتوں کے کریہہ ترین جور و ستم ان کی قوتِ ارادی میں لغزش پیدا نہیں کر سکتے عورتیں ہوں یا بچے، بوڑھے ہوں یا جوان، سب گفتار و کردار میں حسینؑ بن کر حق کی حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ہی وہ ہستیاں ہیں جن کو تاریخ نہیں بناتی بلکہ جو تاریخ کو بناتے ہیں۔ نجم آفندی مرحوم نے کیا خوب کہا کہ ؎

ہر ایک ذرۂ بے حس میں اک تڑپ بھر دی
دماغ وضع کئے دل بنا دیئے تو نے

❁❁❁